R. No. 218657 — Regd. No. 922

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۲۲-۱۵-۹-۱

نئی فون ـ ۹
قیمت تین روپے سالانہ
فی پرچہ سات نئے پیسے

جلد ۲۲۔ شمارہ ۳۷	ایڈیٹر۔ آل احمد سرور	یکم اکتوبر سنہ ۱۹۶۳ء

اداریہ

گاندھی جینتی

۲ر اکتوبر کو گاندھی جینتی ہے۔ یوں تو ہر سال گاندھی جی کا جنم دن ہندوستان میں منایا جاتا ہے۔ ہم نے راج گھاٹ پر ان کی بڑی شاندار سمادھی بنائی ہے۔ گاندھی سمارک ندھی بہت مفید کام کر رہی ہے۔ گاندھی جی کے نام پر ہر بڑے شہر میں ایک سڑک بھی مل جائے گی، ان کا ایک شاندار مجسمہ انڈیا گیٹ سے کچھ فاصلے پر سمندر میں بنانے کی بھی تجویز ہے، مگر سچی بات یہ ہے کہ ہم لوگوں نے گاندھی جی کو ایک ایسا کلاسک سمجھ لیا ہے جس کا احترام کافی ہے مگر جس کا مطالعہ کرنا اور جس کی تعلیم پر عمل کرنا ہمارے لئے ضروری نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟

گاندھی جی بہت بڑے مصلح تھے، وہ بہت بڑے مدبر بھی تھے اُنھوں نے ملک کو آزاد کرایا، سماج میں اصلاح کی، بنیادی تعلیم کے لئے تصور دیا، قومی یک جہتی کے لئے اپنی جان قربان کر دی ہم اُن کے اس احسان سے اُسی وقت سبک دوش ہو سکتے ہیں جب ہماری زندگی میں اُن کی تعلیم کا کچھ عکس ہو۔ ضرورت ہے کہ آج اخلاقی قدروں پر گاندھی جی کی طرح زور دیا جائے اور اُن پر عمل کی کوشش ہو۔ حکومت کے چلانے والوں کو چاہیئے کہ وہ دفتری نظام میں پھنس کر عوام سے دور نہ ہو جائیں، وزیروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا معیارِ زندگی اتنا بلند نہ رکھیں کہ عوام اُن سے دوری محسوس کرنے لگیں۔ افسروں کو چاہیئے کہ وہ حکومت کرنے کے بجائے خدمت کریں۔ سیاسی پارٹیوں کو چاہیئے کہ اپنی جد و جہد میں ذرائع کی پاکیزگی اور طہارت کو نظرانداز نہ کریں، بلکہ پبلک معاملات میں ایک اخلاقی معیار کو ضروری سمجھیں۔ اُستادوں کو صرف اپنے لکھنے پڑھنے سے غرض نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اچھی قدروں کو سماج میں عام کرنے کی بھی کوشش کرنی چاہیئے۔ طلبہ کو فضول کے احتجاجوں اور ہنگاموں میں پڑنے کے بجائے، اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور ملک کی تعمیر میں حصہ لینے کے لئے تیاری کرنا چاہیئے۔ قوم میں اب بھی مذہب، ذات پات، علاقے، زبان کا فرق گو زبان سے نہیں مانا جاتا، مگر عمل میں آ ہی جاتا ہے۔ سماج کا اخلاقی معیار ابھی بلند نہیں ہوا۔ کامیاب آدمی اچھے آدمی سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے اور کامیاب کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنا کام نکال سکتا ہو۔ چینی جارحیت کے خطرے اور ہنگامی حالات کے باوجود خاصی تعداد میں لوگ ایسے ہیں جو اب بھی اپنے نفع کی خاطر ملک کے نقصان کی پروا نہیں کرتے۔ رشوتیں اور سفارشیں اب بھی چلتی ہیں۔ ہمیں اپنے سماج کو ایسے عناصر سے پاک کرنا چاہیئے جو سماج کو اوپر لے جانے کے بجائے نیچے لے جاتے ہیں۔ ہمیں عوام سے محبت پیدا کرنا چاہیئے اور اُن کی خدمت کے لئے اپنے کو تیار کرنا چاہیئے۔ ہمیں قول اور عمل میں یکسانیت پیدا کرنی چاہیئے۔

اس اشاعت میں

ہمیں اقلیتوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہیئے۔ فصل کے بجائے وصل پر زور دینا چاہیئے۔ ہمیں ہر حال میں پورے ہندوستان اور اُس کے سب باسیوں کے مفاد کا خیال رکھنا چاہیئے اور اُن کے معیارِ زندگی کو بڑھانے کے لئے اور اُنھیں مادّی اور ذہنی آسودگی دینے کے لیئے تن من دھن سے کوشش کرنی چاہیئے۔ گاندھی جی کے جنم دن پر ہمیں ان کی اخلاقی تعلیم کو یاد کر کے اُس پر عمل کے لیئے دو لہ عام کرنا چاہیئے۔

سیر بین

آج کل کے شاعروں اور ادیبوں میں ایک نیا مرض پیدا ہوگیا ہے۔ جدید شاعری، جدید افسانہ، جدید ڈراما، جدید تنقید کوئی موضوع ہو، یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کیا کہا گیا ہے، یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہمارا نام ہے یا نہیں۔ کبھی کبھار صرف اسی پر مضمون کی خوبی یا خامی طے کر دی جاتی ہے۔ لیکن کچھ لوگ تو اور آگے بڑھتے ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو نام لئے گئے ہیں وہ کس گروپ کے ہیں، اور پھر اس پر بحث ہوتی ہے کہ یہ نام کیوں لئے گئے۔ چنانچہ لکھنے والوں نے بھی اب ڈر کے مارے یہ شعار بنا لیا ہے کہ وہ موضوع کا حق ادا کرنے کے بجائے طویل فہرستیں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر مضمون میں زیادہ ناموں کی گنجائش نہیں ہوتی تو یہ ضرور لکھ دیتے ہیں کہ جو نام دیئے گئے ہیں وہ صرف مثال کے طور پر ہیں، ویسے اور نام بھی لئے جا سکتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر ناول کے شروع میں مصنف یہ نکتہ ضرور پیش کر دیتا ہے کہ تمام کردار فرضی ہیں اور اگر کہیں کسی کو کوئی مشابہت نظر آتی ہے تو وہ اتفاقی ہے۔ اس سے کوئی جاننے والا دھوکا بھی نہیں کھاتا۔ وہ اس کی اصلیت جانتا ہے، ہاں اس طرح لکھنے والا قانونی چارہ جوئی کے خطرے سے بچ جاتا ہے اسی طرح اس قسم کی فہرستوں سے بھی مضمون نگار، قانونی طور پر محفوظ سہی، لوگوں کی نگاہ میں محفوظ نہیں ہوتے۔ ایک طرف یہ خیال کہ ہر ایسا نام آجائے جو نہ آیا تو ہنگامہ ہو جائیگا، دوسری یہ احتیاط کہ کوئی خفا ہو جائے تو کیا ہوگا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ یا تو ان موضوعات پر آدمی لکھے ہی نہیں، صرف مُردوں پر واویلا کرتا رہے یا پھر بے دھڑک اور ایمان داری کے ساتھ جو کہنا ہے کہے اور اس کی پروا نہ کرے کہ کوئی کیا کہے گا۔ ادب میں سنجیدہ اختلاف مفید ہوتا ہے۔ اہم اور معنی خیز بات اکثر اختلافی ہوتی ہے۔ اگر کسی کے مضمون سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے تو بسا اوقات وہ مضمون گیا گزرا ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی تقریر کے بعد سوالات نہ ہوں تو اسکے صرف دو معنی ہوتے ہیں۔ یا تو سننے والے زبانِ حال سے کہہ دیتے ہیں ع

جا چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر
یعنی مقرر کی بزرگی اور اُس کے سفید بالوں کا لحاظ کر جاتے ہیں، یا تقریر میں کچھ ہوتا ہی نہیں۔

پریس رجسٹرار کی تازہ رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب بھی ہندوستانی زبانوں میں ہندی کے بعد، اُردو کے اخباروں اور رسالوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ امسال خاصی تعداد میں نئے اخبار نکلے ہیں۔ اُردو میں کتابوں کی اشاعت بھی بڑھی ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اُردو ہندوستان میں ترقی کر رہی ہے۔ ہم سے اکثر بیرونی ممالک کے افراد پوچھتے ہیں کہ اُردو کا مستقبل ہندوستان میں روشن ہے یا نہیں۔ ہم انھیں یہ اعداد و شمار دکھا دیتے ہیں اور وہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مگر ہم خود مطمئن نہیں ہیں۔ اُردو ادب ترقی ضرور کر رہا ہے مگر اُردو زبان کی تعلیم میں اس رفتار سے ترقی نہیں ہو رہی ہے جس رفتار سے دوسری زبانوں میں ترقی ہو رہی ہے۔ بہت سی چیزوں کی طرح یہاں بھی ترقی اور تنزل ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ دیکھیں کس کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ کاش ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے کہ ترقی کی رفتار تنزل کی رفتار پر غالب ہے۔

ریاستی شاخ آندھرا کی کامیابی

انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کے وفد کی معروضات کے جواب میں محکمۂ تعلیم آندھرا پردیش کے ڈپٹی سکریٹری نے اپنے خط مورخہ ۱۸ ستمبر کے ذریعہ انجمن کو اطلاع دی ہے کہ ڈائرکٹر تعلیمات کو لکھ دیا گیا ہے کہ صوبے کے سکنڈری اسکولوں میں جہاں کہیں ضرورت ہو اُردو کے متوازی درجات کھول دینے کی ہدایات جاری کر دی جائیں۔ اور مستقل و غیر مستقل اخراجات کی بھی منظوری دے دی جائے تاکہ ضلع پریشد میں پبلک سے عطیات کا مطالبہ کئے بغیر اسکولوں میں متوازی اُردو درجات بلا عذر کھول سکیں۔

(حبیب الرحمٰن جنرل سکریٹری)

ابتدائی تعلیم مادری زبان میں

بھوپال ۔ ۱۸ ستمبر۔ محکمۂ تعلیمات مدھیہ پردیش نے حکم دیا ہے کہ پرائمری درجات تک طلبہ و طالبات کو عام مضامین کی تعلیم مادری زبان میں دی جائے۔ اس طرح اُردو کے طلبہ و طالبات اُردو میں تعلیم حاصل کر سکیں گے۔

از فراق گورکھپوری
ترجمہ: شریف احمد (اردو ناسر پنجر میٹ)

اُردو کے بارے میں عقلمندی اور بے عقلی

دو ایک دن ہوئے کہ مجھے ایک ہندی اجتماع میں ایک مقرر کو سننے کا اتفاق ہوا انھوں نے فرمایا کہ زندگی اور ادب کا تصور اُردو سے بہت دور ہو چکا ہے۔ اور اُردو غزل اور اُردو شاعری نئے اندازِ فکر اور نئی اقدار کو اپنانے میں ناکام ہو چکی ہیں۔ ناکامی کے اسباب پوچھنے پر انھوں نے جو کچھ فرمایا اُسے میں صرف حماقت کا ایسا رتن کہہ سکتا ہوں جس کی کرنیں بڑی "ستانت مآب" ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اُردو ایک اقلیت کی زبان تھی۔ اُردو ادیب احساسِ اقلیت سے پیدا ہونے والے کمتری کے روگ میں مبتلا تھے۔ یہ روگ نیچے ہیں، صحت مند، جان دار اور روشن جدیدیت کا قاتل ثابت ہوا۔ اور یوں یہ لوگ کسی تلافی یا نجات سے بہت پرے ہو گئے۔

کل تک اُردو پر الزام لگایا جاتا تھا کہ اس کی جڑیں ضرورت سے زیادہ ہندوستان کے ماضی میں پیوست ہیں اور آج اس پر جدید نہ ہونے بلکہ جدید دشمن ہونے کا الزام عائد کیا جا رہا ہے۔

یہ اتہام کہ اُردو اہلِ قلم ایک احساسِ کمتری یا احساسِ اقلیت میں مبتلا ہیں اور اس لئے تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کا ساتھ نہیں دے سکتے، مجھے یہ سطور لکھنے پر اکساتا ہے۔ کل ہی کی تو بات ہے کہ نیچے سے لے کر اوپر تک کے انتظام و انصرام کی زبان ـــــ پٹواری اور سپاہی سے لے کر عدالت کی بینچ اور بار تک ـــــ اُردو تھی۔ مختار، وکیل، ایڈووکیٹ، ضلع جج، نیز ہائی کورٹ کے ججوں کو اُردو میں تربیت دی جاتی تھی۔ فوجی یا غیر فوجی یورپی اور پولس افسروں کو اُردو کا امتحان پاس کرنا پڑتا تھا۔ ہر خواندہ یا نیم خواندہ شخص، چاہے وہ کسی بھی محکمہ میں کام کرتا ہو اُردو جانتا تھا، اُردو میں کام کرتا تھا، اُردو نثر و نظم پڑھتا اور محظوظ ہوتا تھا۔ کیا یہ پکارتی ہوئی حقیقتیں اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں میں احساسِ اقلیت پیدا کرتی ہیں۔ ؟ یا اس بات کا اعلان کرتی ہیں کہ اُردو شمالی ہند کے تمام دانشور طبقے کی زبان تھی اور اس علاقے کے ہر اس شخص کی زبان تھی جو اپنے اندر کسی قسم کی روشنی یا رہنمائی کی صلاحیت رکھتا تھا ؟!

ملک کی تقسیم تک پورا غیر منقسم پنجاب اور کشمیر، پورا شمالی مغربی سرحدی صوبہ، اور اس ریاست کا بیش تر علاقہ جسے آج آندھرا پردیش کہا جاتا ہے، اُردو جانتا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا۔ یہاں کے باشندوں نے اُردو میں بڑا جان دار ادب پیدا کیا ہے۔ آریہ سماج، اسناتن دھرم لالہ لاجپت رائے، رام بھج دت چودھری وغیرہ نے اُردو میں بڑے کثیر الاشاعت رسالے نکالے ہیں۔ جب کہ ہندی میں ان لوگوں کے ایسے رسالے نہ ہونے کے برابر تھے۔ پنجاب اور یو۔پی کی بیشتر جوشیلی اور سرگرم تحریکیں اُردو میں چلی ہیں۔ پنجاب اور یو۔پی سے کسی بھی دوسری زبان سے کہیں زیادہ اُردو کتابیں اور رسالے شائع ہوتے تھے۔ کیا یہ سب کچھ اس بات کا ثبوت ہے کہ اُردو ایک اقلیت کی زبان تھی۔

ہندوستان کے ایک بڑے سپوت سوامی رام تیرتھ نے ہی اپنے پیچھے دس ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے اُردو مضامین اور تقریروں کا مجموعہ چھوڑا ہے۔ رادھا سوامی عقیدے کے سربراہ اور دیال باغ، آگرہ، کے بانی کی تمام تصانیف اُردو میں ہیں۔ رادھا سوامی عقیدے کے دوسرے دلیر اور جوشیلے سری شیو ادرت ورما، بھائی پرمانند کاکوری کے شہرت یافتہ سری رام پرساد بسمل اور بیشمار دوسرے اُردو اور صرف اُردو سے وابستہ تھے۔ کیا یہ لوگ ہندوستان کے بیدار مغز طبقوں کی رہنمائی نہیں کرتے تھے ؟ کیا ان لوگوں کی تحریروں میں نوجیون اور سیلابی ہندوستان کا اظہار نہیں ہے ؟ کیا یہ لوگ اقلیت کے ترجمان تھے ؟

کشمنڈو، میسور، مدراس، بنگال، بمبئی اور دوسرے علاقوں میں اُردو ایک منظور شدہ مضمون کی حیثیت سے اسکولوں اور یونی ورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ کیا یہ اس اقلیت کی ضرورتوں کو پورا کرتی تھی جس کی زبان رجعت پرستی اور جدیدیت دشمنی کی وکالت کرتی ہے ؟

اگر اُردو ایک رجعت پرست اقلیت کی زبان ہی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ ایک تہائی صدی تک ہماری تھیٹریکل کمپنیوں کی زبان اُردو رہی۔ اور اس کے بعد ہزاروں سینما گھروں میں اُردو فلمیں دکھائی گئیں اس کی تعبیر کس طرح ہوگی کہ آزادی کے سویرے کے بعد اُردو نثر و نظم کی کتابیں، ناگری خط میں منتقل ہو کر، ہندی کی قبل چھایا وادی 'چھایا وادی' پرگتی وادی شاعری اور جدید شاعری سے ہزار گنا زیادہ فروخت ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ لاکھوں، کروڑوں ہندوستانی ہندی شاعروں کی نسبت اُردو شاعروں سے زیادہ واقف ہیں ؟ اُردو مشاعرے، ہندی کوی سمیلنوں کے مقابلے میں سامعین کے لئے زیادہ دل کشی رکھتے ہیں۔ اور پریم چند، بال مکند گپتا اور اوپندر ناتھ اشک جیسے ادیبوں کے متعلق کیا

ارشاد ہوتا ہے، جن کی مشہور تصانیف اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ہیں۔ کیا یہ لوگ اُردو میں لکھ کر رجعت پرست اور ہندی میں لکھ کر روشن خیال ہو گئے؟

حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان و ادب شر انگیز لسانی تقسیم، تصوراتی تقسیم اور علاقائی تقسیم سب کی بیخ کنی کی ہے، اور اسی آج اندھے لسانی تعصب سے مجبور ہو کر تعلیمی اور انتظامی اداروں میں اس کا گلا گھونٹا اور اسے دھکے دے کر نکالا جا رہا ہے۔

اُردو ادیب، ہندی ادیبوں کے مقابلے میں زیادہ پاکیزہ، ترا شیدہ اور اثر آفریں، ہندی الفاظ روزمرہ اور محاورے استعمال کرتے ہیں۔ پچانوے فی صد ہندی الفاظ کا ذخیرہ اُردو سے آیا ہے۔ اُردو کو مردود قرار دینے کا مطلب ہندی لغات کو مردود ٹھہرانا ہے۔

پرانا پاسبان کل تک شمالی ہند کے جوشیلے اور جیالے باز سپوت کون تھے، راجا رام موہن رائے، پنڈت مدن موہن مالویہ، پنڈت وشنو نرائن در، اجودھیا ناتھ کنزرو، گنگا پرشاد ورما، لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر بھگوان داس، ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر سچیدانند سنہا، تیج بہادر سپرو اور پنڈت موتی لال نہرو — یہ لوگ بیدار ہندوستانیوں کی ایک کہکشاں ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل انگریزی تعلیم اور فارسی، اُردو کے تہذیبی پس منظر سے ہوئی ہے۔ اُردو کی ہلاکت کا نتیجہ اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے، جب ہم پوچھتے ہیں: ان ہستیوں کے جانشین کون ہیں؟ جواب میں صدائے بازگشت آتی ہے — "کون"؟

غلط لسانی حکمت عملی نے ایک تہذیبی بحران پیدا کر دیا ہے، جو ملک کی پوری ترقی اور بلند اخلاقی و ذہنی زندگی کو دھکی دے رہا ہے۔ ہمارے ہاتھوں لائی ہوئی تباہی، خود ہماری تباہی کا باعث بن رہی ہے۔

اگر اُردو ایسی اقلیت کی زبان ہے جو انسانی قدروں تک بہترین اور جدید ترین کے اظہار سے قاصر ہے تو پھر ایسے جید ادیبوں کی تخلیقات کی تاویل کس طرح ہوگی، جیسے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، کنہیا لال کپور، عصمت چغتائی، منٹو، واجدہ تبسم، رام لال، رضیہ سجاد ظہیر، حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، سید احتشام حسین، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، گوپی چند نارنگ اور کلیم الدین احمد — غیر اخلاقی طور پر یہ لوگ ہندوستان کے نشاۃ الثانیہ کی اس روح کی نمائندگی کرتے ہیں جو اپنے اندر ایک طرح تمدن

اور روشن تہذیب کی حرکت و نمو رکھتی ہے۔ اگر اُردو نثر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ہو سکتی ہے تو اُردو شاعری کیوں نہیں؟

اُردو کو مردود و مطعون گردانے کا مطلب حروف و الفاظ کی جمہوریہ میں چھوت، چھات اور نسلی تعصب کا ایک فتنہ انگیز کھیل شروع کرنا ہے۔ ہم نے اس کھیل کی قیمت ادا کرنی شروع کر دی ہے۔ روز حساب کس قدر جلد آ گیا ہے!

پریس نوٹ

انجمن ترقی اُردو کے وفد کی وزیر اعظم سے ملاقات

انجمن ترقی اُردو ہند کا ایک وفد ۱۹ ستمبر کو وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے ان کے دفتر میں ملا اور سہ لسانی فارمولے کے اتر پردیش میں نفاذ کے متعلق وزیر اعظم کو ایک یادداشت پیش کی۔

وفد کی قیادت پنڈت ہردے ناتھ کنزرو صدر انجمن نے فرمائی۔ ممبروں میں ڈاکٹر تارا چند، کرنل بشیر حسین زیدی، پنڈت سندر لال، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر آل احمد سرور اور حیات اللہ انصاری شامل تھے۔

وفد نے وزیر اعظم کو جو یادداشت پیش کی اس میں انھیں یاد دلایا کہ اتر پردیش میں جس طرح سہ لسانی فارمولا نافذ کیا جا رہا ہے اور اس میں جو شرطیں رکھی گئی ہیں اس کے نتیجے میں بیشتر وہ طلبہ جو تیسری زبان کے طور پر اُردو لینا چاہتے ہیں ایسا نہ کر سکیں گے۔ اول یہ شرط کہ اکثریت جو زبان چاہے گی اس کا انتظام کیا جائے گا کسی طرح مناسب نہیں ہے اور اس کی وجہ سے اقلیت اپنے جائز حق سے محروم ہوتی ہے۔ دوسرے ایک سے زیادہ زبانوں کے انتظام کے لئے قابل لحاظ تعداد کی جو شرط رکھی گئی ہے وہ بہت مبہم ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے پرنسپلوں کو انتظام نہ کرنے کا بہانہ مل سکتا ہے۔ تیسرے موجودہ اسٹاف کی شرط بھی دقتوں کو بڑھاتی ہے۔

وفد نے یاد دلایا کہ اب تک اتر پردیش میں ثانوی منزل پر ایک اختیاری مضمون کی پڑھائی کا انتظام کرنے کے لئے پانچ طلبہ کی شرط ہے۔ یہی شرط تیسری زبان کے طور پر اُردو پڑھنے والوں کے لئے بھی لگائی جا سکتی ہے۔

وفد نے یہ بھی درخواست کی کہ پچھلی مردم شماری کے مطابق اتر پردیش کے جن علاقوں میں اُردو بولنے والوں کی قابل لحاظ آبادی ہے ان میں خاصی تعداد میں تیسری زبان کے طور پر اُردو کی پڑھائی کا انتظام کیا جائے اور تمام سرکاری اسکولوں میں اصولاً ضرور ہی ایسا کیا جائے۔

وفد نے یہ بھی کہا کہ اگر درخواست کے باوجود کسی جگہ انتظام نہ ہو تو براہ راست ڈائرکٹر تعلیم کو توجہ دلانے کی اجازت ہونی چاہیے جو اس کے لئے مناسب احکام جاری کرے۔

وفد نے یہ بھی درخواست کی کہ لسانی اقلیتوں کے کمشنر سے سہ لسانی فارمولے کے نفاذ کے متعلق علیحدہ رپورٹ مانگی جائے۔

وزیر اعظم نے تقریباً پون گھنٹے تک ہمدردی سے تبادلۂ خیالات کیا اور وعدہ کیا کہ وہ وفد کے معروضات پر ہمدردی سے غور کریں گے۔

(پروفیسر آل احمد سرور)
جنرل سکریٹری

رحمٰن جامی

نذرانے

نویدِ شوق، خوشی کا پیام لایا ہوں
غمِ حیات کے ماروں کے نام لایا ہوں
نچوڑ کر ثمرِ دل سے زندگی کی شراب
چھلکتے بادۂ عرفاں کے جام لایا ہوں
دیارِ حُسن سے آیا ہوں زندگی لے کر
حسین صبح، حسیں رنگِ شام لایا ہوں
وہ گیت لایا ہوں جن میں ہے پیار کی خوشبو
نگارِ زیست کے نغمے تمام لایا ہوں
بلند کر کے زمانے میں امن کے پرچم
شعورِ حُسن بقائے دوام لایا ہوں
بنا کے حُسن کو سیتا شباب کو بن باس
"شکستِ راون" و "توقیرِ رام" لایا ہوں
جہاں کو اس سے حسیں نذر دے نہیں سکتا
جہاں کے واسطے جامیؔ کلام لایا ہوں

ظہیر غازی پوری

"خیال کے آہو"

ذہنِ شاعر بسیط صحرا ہے
جس میں کتنے خیال کے آہو
چوکڑی بھرتے رہتے ہیں ہر دم
تیز و طرّار اور بے قابو
پھر بھی شاعر بچھائے فکر کے دام
دیر تک انتظار کرتا ہے
رم پہ آتے ہیں جب حسیں آہو
شاعر ان کا شکار کرتا ہے

سلام بن رزاق پنویلی

آنسو

ایک آنسو مری مژگاں سے ڈھلک آیا ہے
لختِ دل ہے کہ دہکتا ہوا انگارہ ہے
خیر جو بھی ہو اسے خاک میں مل جانا ہے
کیوں نہ پھر اس کو عطا کر دوں حیاتِ ابدی
دستِ امروز سے اک نشترِ فردا لے کر
چھیڑ دوں اس کے لرزتے ہوئے ننھے دل کو
شاید اس قطرۂ خوں ناب کے دل کی تہہ سے
پھوٹ نکلے کوئی نادیدہ مسرت کی کرن
اور غم خانۂ عالم کو درخشاں کر دے

غزلیں

چندر پرکاش شاد

عشق جب ڈولتا نظر آیا
غم گرہ کھولتا نظر آیا
دلِ ویراں جو سیر کو نکلا
باغ پر تولتا نظر آیا
آپ ہی میں سماعتوں میں گم
آپ ہی بولتا نظر آیا
لبِ شیریں ہر ایک جنبش پر
دل میں رس گھولتا نظر آیا
حادثہ ایک اک تمنا کو
خاک میں رولتا نظر آیا
تیرے جس انگ پر نگاہ پڑی
بولتا بولتا نظر آیا

ناظم سیوانی سہسرامی

عہدِ وفا کے جب سے گنہگار ہم ہوئے
ہر جرمِ ناسزا کے سزاوار ہم ہوئے
سارا چمن ہے گود میں دامِ فریب کی
جس شاخِ گل پہ بیٹھے گرفتار ہم ہوئے
سب کچھ سہی چمن میں ترے باغباں مگر
وہ گل نہیں ہے جس کے طلبگار ہم ہوئے
ارماں کو زندگی ملی حسرت ہوئی شہید
سچ ہے کہ کامیاب سرِ دار ہم ہوئے
ناظمؔ ہے زندہ نامِ وفا گرچہ مدتوں
رُسوا ہوئے، ذلیل ہوئے، خوار ہم ہوئے

نازش انصاری (علیگ)

بفیضِ ضبطِ وفا مسکراتے ہیں ورنہ
ہماری جان پہ کیا کیا ستم نہیں ہوتے
بہار ڈھونڈنے والو مرے قریب آؤ
کہ دل کے داغ بھی پھولوں سے کم نہیں ہوتے
مذاقِ عشق عطا کرتا ہے جو احساسات
انھیں کچھ اور ہی کہیے وہ غم نہیں ہوتے
عجیب شے ہیں محبت کی منزلیں اے دوست
یہ فاصلے کبھی قربت سے کم نہیں ہوتے
خدا نے بخشا ہے خود دار دل جنھیں نازشؔ
وہ لوگ شکوہ طرازِ ستم نہیں ہوتے

محمد منظور احمد

ازل سے تشنگی، مہنگی پڑی ہے
مئے فرزانگی، مہنگی پڑی ہے
رہا باقی نہ تارِ پیرہن بھی
"خودی سے بیخودی، مہنگی پڑی ہے"
کوئی کرتا ہے شکوہ بے رُخی کا
کسی کو دوستی، مہنگی پڑی ہے
جہاں دیکھا انھیں گلچیں نے توڑا
گلوں کو تازگی، مہنگی پڑی ہے
تمنا خوں شدہ دل کی تمنا
بنامِ زندگی، مہنگی پڑی ہے
جنونِ عشق ہی کام آیا منظورؔ
خرد کی آگہی، مہنگی پڑی ہے

سید صدیق حسن مرحوم کی چند غزلیں

ہماری زبان (۱۵ ستمبر ۱۹۶۳ء) میں سید صدیق حسن مرحوم آئی سی ایس، ممبر بورڈ آف ریونیو لکھنؤ کی وفات پر آپ کا شذرہ دیکھا۔ ان کی شخصیت، قومی جذبات اور اُن کی ادبی دلچسپیوں پر ایک مضمون شایع کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ نے جوانی کی شاعری اور لکھنؤ کی ادبی صحبتوں کا ذکر کیا ہے اس پر مجھے ان کی کچھ غزلیں یاد آگئیں جو ان کے ایک دوست ناظر کاکوروی نے ان کی زندگی ہی میں کراچی کے ایک رسالے میں شایع کی تھیں۔ یہ غزلیں ناظرین ہماری زبان کی ضیافتِ طبع کے لئے بھیج رہا ہوں۔ ان کا مجموعۂ کلام ادارۂ انیس اُردو الہ آباد کی طرف سے شایع ہونے والا تھا معلوم نہیں اس کا کیا ہوا۔ ضرورت ہے کہ ان کا مجموعہ ایک اچھے مقدمے اور ان کے حالاتِ زندگی کے ساتھ جلد شایع کر دیا جائے۔

ادارۂ علوم اسلامیہ ——— مختار الدین احمد

(۱)

دم بدم گردشِ دوراں کا سلام آتا ہے
کبھی اس طرح بھی جینے کا پیام آتا ہے

جب کہیں تذکرۂ جور ستم آتا ہے
کیا کہیں آپ کیوں لب پہ نام آتا ہے

اب تو اس طرح سے آتا ہے ترا دل میں خیال
جیسے منزل پہ مسافر سرِ شام آتا ہے

یہ رہِ الفت کی گزرگاہ ہے اور سایۂ مرگ
ایسا ہی نقشِ قدم گام بہ گام آتا ہے

منہ پہ ڈالے ہوئے پابندیٔ ایماں کی نقاب
صرف پینوں کے لئے دور میں جام آتا ہے

غمزہ و عشوہ کی صد رنگ کمیں گاہوں سے
بارہا سادہ دلوں کو بھی سلام آتا ہے

زندگانی میں اک ایسی بھی ہے منزل کہ جہاں
عشرتیں ساتھ لئے غم کا پیام آتا ہے

کبھی آوازِ جرس بھی نہیں آتی ہمدم
کبھی پیغامِ سفر گام بہ گام آتا ہے

تیرگی حد سے گزرتی ہے جب اندھیاروں کی
تب کہیں مہرِ درخشاں کا پیام آتا ہے

(۲)

محبت شعلۂ دامن بن گئی ہے
یہ دنیا سنگ و آہن بن گئی ہے

محبت حادثہ پہلے پہل تھی
مگر اب دل کی دھڑکن بن گئی ہے

جلا ڈالا ہے جس نے دانہ دانہ
وہ بجلی آپ خرمن بن گئی ہے

وہ افسوں ہے کہ ہر تیلی قفس کی
نشیمن در نشیمن بن گئی ہے

محبت نے کبھی کی رہنمائی
کبھی دانستہ رہزن بن گئی ہے

ہر اک گتھی جو سلجھائی خرد نے
بالآخر دل کی الجھن بن گئی ہے

وہ ہر اک راگنی بیتے دنوں کی
زباں پر آکے شیون بن گئی ہے

کئے دیتی ہے بزمِ دل کو تاراج
نگاہِ دوست دشمن بن گئی ہے

جو موج آغوشِ ساحل میں پلی تھی
نئے طوفاں کا مسکن بن گئی ہے

(۳)

مرتے نہیں ہم عشق کی بیگانہ روشی پر
جیتے ہیں محبت کے اشاراتِ خفی پر

بھولے سے بھی لاؤ نہ خیال اپنے کہے کا
آجائے نہ حرف عصمتِ پیماں شکنی پر

اللہ رے کیا چیز تھی بربادیٔ دل بھی
تعمیر ہوا خُلد محبت تو اسی پر

یوں دیتے ہیں احباب مجھے ہوش کی دعوت
جیسے مرا بس چلتا ہے آشفتہ سری پر

آؤ نہ مرے پاس کہ آجائے مجھے ہوش
الفت کو بھروسہ ہے تو دیوانہ روشی پر

جاتی نہیں ہے دردِ جدائی کی یہ لذت
کھاؤ نہ ترس تم مری افسردہ دلی پر

ہے یاد کسی کی مرا سرمایۂ خلوت
یہ راز ہے ظاہر نہ کرو اس کو کسی پر

الفت کا تقاضہ تو ہمیشہ سے یہی ہے
آہوں کو تم الزام نہ دو بے اثری پر

مقصودِ سفر ہے کوئی منزل تو نہیں ہے
ٹوکو نہ مجھے تم مری بے راہ روی پر

(۴)

اہلِ کشتی خوش نہ ہوں طوفاں اگر کوئی نہیں
بارہا ایسے ڈبو دیتی ہے موجِ تہ نشیں

اپنے دامن پر ہو نازاں تم نے دیکھا ہی نہیں
جو کچل جاتے ہیں آسودہ بھی ہوتے ہیں حسیں

خام تھا جب تک مذاقِ فکر میرا ہم نشیں
میں سمجھتا تھا کہ شک ہے ایک عذرِ یقیں

بے سہارا ہو چلا تھا کاروانِ زندگی
آکے ڈھارس دے گئی اس کی نگاہِ خشمگیں

ایک خاموشی تو ہوتی ہے نڈھال و مضمحل
ایک خاموشی ہے لیکن شعلہ بار و آتشیں

یہ بھی نظارے مری آنکھوں نے دیکھے بارہا
آفتاب ابھرا کئے اور ظلمتیں بڑھتی گئیں

ایک فردوسِ تصور اک گلستانِ خیال
ہجر کی تنہائیاں بھی ہو گئیں آخر حسیں

کیا کہوں تم سے کہ میری دسترس میں آج کل
ان کا دامن بھی نہیں اپنا گریباں بھی نہیں

جانتا ہوں اب نہیں کانٹوں میں پہلی سی خلش
پر چھڑاؤں اپنا دامن آہ یہ ممکن نہیں

(۵)

وادیٔ شوق میں جو شعلہ بداماں نکلا
واقفِ رسم و رہِ کوچۂ جاناں نکلا

فکرِ فردا غمِ دوشینہ سے آزاد ہوا
خوش نصیب اپنا دلِ سوختہ ساماں نکلا

تجھ سے امید ہو کیا دشت نوردوں کو بہار
تیرا ہر حوصلہ پابندِ گلستاں نکلا

فصلِ گل رنگِ چمن قافلۂ ابرِ بہار
ان میں کوئی نہ شریکِ غمِ انساں نکلا

کیا ستم ہے دلِ ناشاد کہ یہ دورِ خزاں
نازپروردۂ اربابِ گلستاں نکلا

فہم و ادراک سے آگے ہے یقیں کی منزل
عقل کا عجز ہی سرچشمۂ ایماں نکلا

اپنا ہر تارِ قبا جس نے جنوں کو بخشا
میرے ہمراز وہ میرا ہی گریباں نکلا

بڑھ کے خود وادیٔ الفت نے قدم چوم لئے
وہ مرا عزمِ سفر تا درِ جاناں نکلا

جاوداں ہو دل کی عمر بڑی خیر ہوئی
غم زدہ زیست پہ یہ بھی ترا احساں نکلا

جے پور میں ٹریفک ویک کا انعقاد

جے پور۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۶۳ء (ڈاک سے) جے پور پولس کی جانب سے ۹ ستمبر تا ۱۴ ستمبر ٹریفک ویک منایا گیا جس کے پروگرام میں کھیل، شو، قوالیاں اور اُردو مشاعرہ بھی تھا۔ رام لیلا گراؤنڈ میں ایک شاندار نمائش لگائی گئی جس میں ٹریفک قوانین کو تصاویر کے ذریعہ عوام کے ذہن نشین کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں ٹریفک قوانین اور قواعد سُرخ کپڑوں پر لکھے ہوئے شہر کے تمام بڑے بڑے بازاروں اور چوراہوں پر لگائے گئے تھے۔ ان ہی قوانین اور قواعد کے مطبوعہ پوسٹر بھی عوام کی آگاہی اور ہدایت کے لئے جگہ جگہ چسپاں کئے گئے تھے لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ تمام پوسٹر، ہینڈبل، تصاویر کی سرخیاں اور بازاروں میں لگے ہوئے سُرخ کپڑوں کی تحریر ہندی اور انگریزی میں تھی۔ غریب اُردو کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا حالانکہ ۱۲ اگست کو حکومت راجستھان اپنے حکم نمبری F-5 (6) APP T S (A) IV 62 کے ذریعے تمام کلکٹروں اور اعلیٰ عہدیداروں کو مطلع کر چکی ہے کہ تمام ایسے قوانین، جو لسانی اقلیتوں کے مفاد میں ہوں اُردو، پنجابی اور سندھی میں بھی شائع کئے جائیں۔ جہاں ان کی آبادی پندرہ سے بیس فی صدی یا اس سے زیادہ ہو اور جے پور میں اُردو داں طبقے کا تناسب آبادی کیا ہے یہ حکام بالا دست سے پوشیدہ نہیں ہے پھر بھی نہ جانے کیوں اُردو کو اس کا جائز حق نہیں دیا گیا حالانکہ قوالی اور مشاعرے کا انعقاد اُردو کی عظمت کا کھلا اعتراف ہے۔

مشاعرہ وقت کی رفتار کا سب سے بڑا نباض ہوتا ہے چنانچہ ٹریفک ویک کے منعقدہ مشاعرے میں مولوی احترام الدین احمد صاحب شاغل عثمانی نے انتہائی جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے یہ قطعہ سرِ مشاعرہ ارشاد فرمایا:۔

لال کپڑے پہ ٹریفک کے ہیں کاشن سیکڑوں
ہندی انگریزی پڑھوں کی جانکاری کے لئے
لیکن اُردو کا کہیں نام ونشاں مطلق نہیں
گویا مستثنیٰ ہیں اُردو داں ہر اک قانون سے

پندرہ ہزار سے زائد سامعین میں داد کا ایک بے پناہ شور بلند ہوا جس میں وزراء، پولس اور سول کے اعلیٰ حکام اور کثیر تعداد عوام کی تھی۔ بار بار قطعہ پڑھنے کی فرمائش کی گئی اور ہر مکتبِ خیال کے لوگوں نے شاغل صاحب کے اس جرأت مندانہ اقدام کو سراہا۔ اور بعض سنجیدہ پولس افسران نے دبی زبان میں اپنی اس کوتاہی کا اعتراف بھی کیا لیکن پولس ہی کی اصطلاح میں "اعترافِ جرم نوعیتِ جرم کو کم نہیں کرتا" اُردو داں طبقہ اس سے مطمئن نہ ہو سکا۔ کیا پولس حکام سے یہ امید کی جائے کہ آئندہ یہ روایت نہیں دہرائی جائے گی اور حکومت کے احکام کا احترام کرتے ہوئے اُردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے گا۔ (اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو)

لسانی فارمولا اور ڈائرکٹر تعلیمات راجستھان

اخبار "ہماری زبان" مورخہ یکم ستمبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۷ میں درج ہے کہ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن بیکانیر نے فی الحال سنسکرت لسانی فارمولا میں لازمی طور پر پڑھائے جانے کے احکامات صادر کر دیے ہیں" تعجب ہے کہ سررشتہ تعلیم کے سب سے بڑے عہدہ دار نے ایسا حکم کیسے صادر کر دیا جب کہ کسی میٹنگ ذیل کی جو کسی موقع پر ہوئی ہو اس کی یہ منشا نہ تھی اور اس طرح خود انھوں نے اپنے ہی علم کی خلاف ورزی کی جس کو میں نے item ع۲ (a) پر ظاہر کیا ہے۔ سنسکرت کسی طرح سہ لسانی فارمولا میں تیسری زبان کے طور پر لازمی قرار نہیں دی جا سکتی بلا سرپرست کی خواہش معلوم کیے کوئی زبان اپنی طرف سے نہیں لادی جا سکتی۔ مگر یہاں حالت کچھ اور ہے۔ اتر پردیش گورنمنٹ و ڈائرکٹر تعلیمات یو۔ پی نے جو احکام صادر کیے ہیں وہ یہ ہیں کہ سہ لسانی فارمولا میں تیسری زبان دستور ہند کے (ہندی کے علاوہ) ۱۳ زبانوں میں سے کوئی ایک زبان لی جا سکتی ہے اور اگر انتظام ہو سکے تو ایک سے زیادہ زبانیں تیسری زبان کی حیثیت سے لی جا سکتی ہیں یہاں سنسکرت لازمی نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ ایک ہی فارمولے کے دو جگہ دو مختلف معنی لگائے جا رہے ہیں۔ گو کہ اس فارمولے میں تیسری زبان کوئی کلاسیکل زبان مثلاً سنسکرت وغیرہ نہیں شامل کی جا سکتی بلکہ اس فارمولے میں تیسری زبان اردو یا مادری زبان یا اقلیتی زبان یا کوئی جدید ہندوستانی زبان ہی ہو سکتی ہے۔ ہندی (علاقائی زبان) و انگریزی دو زبانیں طے ہو جانے کے بعد اُردو ہی وہ زبان ہے جو سارے ہندوستان میں سب سے زیادہ بولی و سمجھی جاتی ہے، اُس کا سہ لسانی فارمولا میں تیسری زبان قرار دیا جانا مقتضائے انصاف تھا۔ چاہے کچھ بچے کوئی اور جدید زبان پڑھیں مگر جو لوگ اُردو لینا چاہیں یا جن کی مادری زبان اُردو ہے ان کو یہ حق و اختیار ہے اور یہ آسانی دی جانی چاہیے کہ اُردو پڑھیں۔ مرکزی گورنمنٹ کا پریس نوٹ مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۹۵۸ء جو تاریخی حیثیت رکھتا ہے اُس میں صاف طور سے اعلان ہوا ہے کہ اُردو سکنڈری اسٹیج میں یعنی درجہ ۶ سے درجہ ۸ تک پڑھائی جائے اس کو سب اسٹیٹ نے مانا ہے۔ کچھ اور باتیں ذیل میں درج کرتا ہوں :-

(۱) وزرائے اعلیٰ کی بشمول مرکزی وزرا جو کانفرنس اگست ۱۹۶۱ء میں زیر صدارت آنریبل پنڈت جواہر لال نہرو صاحب وزیر اعظم ہند ہوئی تھی اور سکنڈری اسٹیج میں تین زبانوں کی جو شکل دی گئی تھی اُس میں نمبر ایک پر مادری زبان کا لیا طے ہوا تھا۔ (ملاحظہ ہو پیرا ۹ فیصلہ کا)

(a) The Regional language and mother tongue when the later is different from the regional language
(b) Hindi or in Hindi speaking area another Indian language
(c) English or any other modern Earopeon language -

اُسی رپورٹ کے پیرا ۳ (b) میں درج ہے کہ وہ زبان جدید ہندوستانی زبان ہوگی۔

The language used should he modern Indian language mentioned in the 8th schedule of the constitution as well as english.

(۲) وزرائے تعلیم کی جو کانفرنس ڈاکٹر شریمالی کی صدارت میں ہوئی تھی اُس میں طے ہو گیا تھا کہ جدید ہندوستانی زبانوں کے ساتھ کوئی کلاسیکل زبان مثلاً سنسکرت شامل نہ ہوگی۔ (ملاحظہ ہو ہماری زبان ۲۲ مئی ۱۹۶۳ء)

(۳) National Integration کانفرنس جس کی صدارت بھی آنریبل وزیر اعظم ہند نے کی جس میں مرکزی وزرا۔ وزرائے اعلیٰ صوبجات۔ پارلیمنٹ کے پولیٹکل پارٹیز کے لیڈران۔ انڈین نیشنل کانگریس کے نیشنل انٹی گریشن کمیٹی کے چیرمین۔ یو نی ورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیرمین۔ دو ماہر تعلیم۔ کمشنر لسانی اقلیت کمشنر شیڈیول کاسٹ و شیڈیول ٹرائب۔ سات اشخاص نامزد کردہ آنریبل وزیر اعظم ہند۔ شامل تھے، اس کے پیرا ۱۲ میں درج ہے کہ سہ لسانی فارمولا میں ہندی بولنے والے علاقے میں تیسری زبان جدید ہندوستانی زبان ہوگی۔

(۵) اُس فیصلے کے پیرا ۷ میں درج ہے کہ کانفرنس کو امید ہے اور یقین ہے کہ اس فیصلہ و سفارشات کے عمل میں لانے سے نیشن کی انٹی گریٹی (Solidarity) قائم رہنے میں مدد ملے گی۔

(۶) سنسکرت کلاسیکل و قدیم زبان ہے جدید زبان نہیں ہے اگر قدیم زبان رکھنی منظور ہوتی تو فارسی عربی جو کلاسیکل زبانیں ہیں وہ بھی ضرور شامل ہوتیں جو قریب ایک درجن سے اوپر یونی ورسٹیوں میں اونچے درجوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

(۷) آنریبل وزیر اعظم ہند نے بھی کہا ہے کہ سنسکرت سہ لسانی فارمولا میں شامل ہونا نہیں طے ہوا تھا۔

(۸) سنسکرت کا ایک پرچہ ہندی کے ساتھ ہوتا ہے

اور کل بچے پہلے ہی سے لازمی طور سے سنسکرت یو پی میں پڑھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اور کسی صوبہ میں لگی بھی ہو۔

(۹) جیسی جو سہ لسانی فارمولا کے اجرا کے لئے من جانب ڈائرکٹر تعلیمات یو۔پی اجرا کی گئی ہے اس میں ایک بہت اہم بات درج ہے کہ تیسری زبان کا انتخاب مقامی ضرورت کے مطابق ہو اور سرپرستوں کی خواہش معلوم کی جائے اور ایک سے زیادہ زبانیں پڑھائی جا سکتی ہیں اگر انتظام ہو جائے۔ بلحاظ مقامی ضروریات تیسری زبان سوائے اردو کے اور کیا ہو سکتی ہے جو بموجب لسانی نقشہ ۱۹۳۱ء مرتبہ منجانب کانگریس نہ صرف یو۔پی کی زبان تھی بلکہ اجمیر ماروار، بہار، دہلی، سی۔پی، صوبہ سرحد اور پنجاب کی زبان اردو تھی بقیہ صوبجات ہندوستان میں ۲۵ فی صدی سے لے کر ۹۰ فی صدی تک بولی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے ایسی ہی چٹھی دوسرے صوبوں میں بھی اجرا ہوئی ہو۔

(۱۰) اردو جو دنیا کی زبانوں میں تیسرا درجہ رکھتی ہے اور ہندوستان میں ہر جگہ بولی و سمجھی جاتی ہے اور یو۔پی و مختلف علاقوں کی واحد زبان تھی جس نے ملک کی آزادی میں اہم رول ادا کیا ہے کیا اس کی مستحق نہیں کہ اس فارمولا میں تیسری زبان کے طور پر پڑھائی جائے۔

(۱۱) جہاں تک صوبہ اتر پردیش و بہار کا تعلق ہے اردو کو علاقائی زبان قرار دی جانے کے لئے ۲۲ لاکھ کے قریب دستخطیں و ۹ لاکھ ۱۵ ہزار دستخطیں بالترتیب عالیجناب صدر جمہوریہ بالقابہ کی خدمت میں پیش ہیں اور جگہ سے بھی ایسی درخواستیں دی جا سکتی تھیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تیسری زبان اردو رکھی جائے یا چونکہ یہ ہندوستانی زبانوں میں اردو لینے والے بچوں کو خاص طور سے سہولت دی جائے اور ماتحتین کو سخت ہدایتیں دی جائیں کہ جو بچے تیسری زبان کی نسبت سے اردو لیں ان کے راستے میں رکاوٹیں نہ ڈالی جائیں جیسی کہ پیش آ رہی ہیں۔

(۱۲) جہاں تک راجستھان کا سوال ہے پہلے سنسکرت درجہ ۵ سے ۸ تک لازمی مضمون تھا۔ مگر خود ڈائرکٹر صاحب تعلیمات راجستھان نے اپنے خط بمقام بیکانیر مورخہ ۱۳ رجولائی ۱۹۵۹ء (D0 EDB/ACA/2/14139/96/59) سے سنسکرت کو لازمی مضمون سے ہٹا دیا ہے اور اس کو اختیاری مضمون کر دیا ہے۔ اور اسی خط میں درج ہے کہ گورنمنٹ اس معاملے کو بڑی اہمیت دیتی ہے اور اس ہدایت کی عدول حکمی بہت سختی سے دیکھی جائے گی۔ لسانی اقلیت کے تحفظات کے سلسلے میں کمشنر لسانی اقلیت کی سفارش ہے کہ یہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ اقلیت اپنی مادری زبان تین زبانوں میں سکنڈری اسٹیج میں پڑھ سکیں۔ اب ڈائرکٹر صاحب تعلیمات بیکانیر (راجستھان) کس طرح سنسکرت کو سہ لسانی فارمولا میں تیسری زبان لازمی کر سکتے ہیں۔ علاوہ بریں راجستھان گورنمنٹ نے جس سہ لسانی فارمولا کو مانا ہے اس میں مادری زبان کو خاص اہمیت ہے (ملاحظہ ہو صفحہ ۷۷ عا دوسری رپورٹ کمشنر)

(۱۳) اتر پردیش گورنمنٹ نے جناب کمشنر لسانی اقلیت کے سوال پر اپنے خط نمبر 61/XXI-12-1959 مورخہ ۴ رجولائی ۱۹۶۱ء یہ جواب دیا ہے کہ گورنمنٹ اس اصول کو مانتی ہے کہ سہ لسانی فارمولا میں اقلیتی زبان شامل ہونی چاہئے۔

(۱۳) آل انڈیا کنونشن جو اگست ۱۹۶۱ء میں ہوا تھا جس میں ہندوستان کے کل وزرائے تعلیم اور کچھ معتمد لوگوں نے شرکت کی تھی جس کا فیصلہ وہاں کی تقریروں، سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن و کانگریس ورکنگ کمیٹی کے فیصلوں کی بنیاد پر ہوا تھا اور جس کا فیصلہ اب تک کل ہندوستان کے لئے لاگو ہے۔ اس میں صاف طور سے طے ہوا تھا کہ پرائمری کلاسوں میں ذریعہ تعلیم و امتحان مادری زبان ہو۔ غیر ہندی مادری زبان والے بچوں کو (یعنی اردو والوں کو) درجہ ۳ سے پہلے علاقائی زبان (یعنی ہندی) نہ پڑھائی جائے۔ کل اسکول میں چالیس یا درجہ میں دس لڑکے ہوں تو ایک استاد اس زبان کے پڑھانے کے لئے مقرر کیا جائے۔ یہاں یہ مطلب نکالا جاتا ہے کہ ۴۰ یا ۱۰ بچے ہوں تو اردو پڑھائی جائے گی ورنہ نہیں۔ جو کبھی ۵۰ کی منشا نہیں ہے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ تھا کہ اردو ایک زبان متعلقہ ہو گی۔

(۱۴) مرکزی گورنمنٹ ہوم ڈیپارٹمنٹ کا وہ تاریخی بیان مورخہ ۱۴ رجولائی ۱۹۵۸ء جس کی بڑی اہمیت ہے جس میں اردو کے مقام کو واضح کیا گیا ہے جس میں اردو کے لئے ۵ سہولتوں کا اعلان کیا گیا ہے جس کو اسٹیٹ گورنمنٹوں نے مانا ہے اس کی سہولت نمبر ۳ ہے کہ تعلیم کے سکنڈری اسٹیج میں یعنی درجہ ۶ سے درجہ ۸ تک اردو تعلیم کی سہولت دی جائے۔ یہ فیصلہ پورے ہندوستان کے لئے ہے جس میں راجستھان شامل ہے۔ اس کے الفاظ یوں ہیں:-

Facilitees for ins truction in urdu Should also he provided in the Secondary Stage of Education.

کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس حکم سے انحراف کرے۔

(۱۵) دستور ہند کی ۱۴ زبانوں میں سنسکرت کو چھوڑ کر سوائے اردو کے کل بارہ زبانیں کسی نہ کسی صوبے میں

علاقائی زبان ہے تو جب اُردو بھی دستور کی ایک مسلّمہ زبان ہے تو کیا وہ زبان اُردو جس کو صوبجات مذکورہ بالا سندرجہ پیرا ۹ میں علاقائی زبان کا درجہ ملنا چاہیے، پڑھائے جانے سے بھی محروم کی جا رہی ہے۔

امید ہے یہ حق تلفیاں دور ہو کر رہیں گی۔

ذاتا رسول
سکریٹری انجمن ترقی اردو بنارس

مجلس تحقیقات اُردو، دلّی یونیورسٹی

دہلی - ۲۴ ستمبر۔ انجمن تحقیقات اُردو شعبۂ اُردو دلّی یونیورسٹی کے ایک جلسے میں گزشتہ سنیچر کو ڈاکٹر محمد حسن ریڈر شعبۂ شبینہ کالج دلّی یونیورسٹی نے ایک مقالہ "اُردو ادب کے فکری پس منظر" کے عنوان سے پڑھا۔ اس مقالے میں انھوں نے واضح کرنے کی کوشش کی کہ اُردو کے ادبی مزاج کی تشکیل ہندو فلسفے اور اسلامی تصوّف کے امتزاج سے ہوئی۔

ہندو اور اسلامی تصوّف کی بنیادی اقدار سے بحث کرتے ہوئے موصوف نے اُردو ادب کی رمزیت کی فکری معنویت کو واضح کیا اور بتایا کہ اُردو ادب کی نشو و نما میں تصوّف کے زیرِ اثر رواداری، انسان دوستی، وسیع المشربی، آزاد خیالی اور مساوات کے تصوّرات پیدا ہوئے۔

مقالے کے بعد ڈاکٹر تارا چند نے جو جلسے کے صدر تھے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ تصوّف کا نشو و نما دراصل ہر دور، ہر نسل اور ہر مذہب میں ہوا۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ تصوّف صرف آریائی ذہن سے مخصوص ہے۔ تصوّف خواہ کسی شکل میں کیوں نہ ہو روحانی اقدار کی تلاش ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسلامی اور ہندو تصوّف کی گہری مماثلت پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ اسلامی تصوّف کا عروج خاص طور پر عراق اور بلخ میں ہوا۔ عراق میں مصر کے اثرات نمایاں تھے اور مصر و بلخ دونوں جگہ ہندو اور بودھ عالموں کی خاصی تعداد آباد تھی۔

وزیرِ اعظم کو انجمن کا توجہ نامہ

انجمن ترقی اُردو ہند کے وفد نے جس کی قیادت مسٹر ہیرو دے ناتھ کنزرو کر رہے تھے وزیرِ اعظم کو حسبِ ذیل توجہ نامہ پیش کیا:-

۱- ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ اور مرکزی وزیروں کا جو اجلاس ۱۰، ۱۱ اور ۱۲ اگست ۱۹۶۱ء کو ہوا تھا اس نے حسبِ ذیل سہ لسانی فارمولے کی سفارش کی تھی:

(الف) اگر علاقائی زبان ہی مادری زبان نہ ہو تو علاقائی زبان اور مادری زبان۔

(ب) ہندی، یا ہندی بولنے والے علاقوں میں کوئی دوسری ہندوستانی زبان، اور

(ج) انگریزی یا کوئی دوسری جدید یورپی زبان۔

۲- وزیرِ اعظم نے ۱۹۶۲ء میں مولانا حفظ الرحمٰن کے نام ایک خط میں کہا تھا کہ (ب) کے تحت مشمول اُردو کوئی بھی جدید ہندوستانی زبان لی جا سکتی ہے اور سنسکرت چونکہ ایک کلاسیکی زبان ہے اس لئے اُسے اس میں نہیں شامل ہونا چاہیئے۔

۳- ریاستوں کے وزرائے تعلیم کے ایک جلسے میں جو جنوری ۶۳ء میں ہوا تھا اور جس کی صدارت اس وقت کے مرکزی وزیرِ تعلیم ڈاکٹر کے ایل شری مالی کر رہے تھے، متفقہ طور پر قرار پایا تھا کہ سنسکرت چونکہ ایک کلاسیکی زبان ہے اس لئے وہ (ب) کے تحت نہیں پڑھائی جانا چاہیئے۔

یو۔پی کے وزیرِ تعلیم اچاریہ جگل کشور اس جلسے میں موجود تھے اور انھوں نے اس قرارداد سے اتفاق کیا تھا۔

۴- اس بارے میں حکومت یو۔پی کی پالیسی ڈائرکٹر تعلیمات کے ایک خط (نمبر سکنڈری / ۱۱۹۷ / ۳۶ - ۷۵ مورخہ ۲۲ جولائی ۶۳ء) میں جو ڈسٹرکٹ انسپکٹرس آف اسکولس بمبئی کو لکھا گیا تھا بیان کی گئی ہے۔ خط میں کہا گیا ہے کہ:-

سہ لسانی فارمولا درجہ ۹ میں موجودہ سیشن سے جاری ہوگا۔ زبانیں یہ ہوں گی:-

(۱) ہندی۔

(۲) انگریزی یا کوئی دوسری جدید یورپی زبان۔

(۳) حسبِ ذیل زبانوں میں سے کوئی ایک:-
سنسکرت، اُردو، پنجابی، بنگالی، گجراتی، مراٹھی، آسامی، کنڑی، کشمیری، ملیالم، اڑیا، تامل اور تلگو۔

تیسری زبان کے انتخاب کے سلسلے میں اصول یہ ہیں۔
طلبہ کے سرپرستوں کی خواہش اور مناسب عملے کی موجودگی۔ سرپرستوں کی خواہش تحریری طور پر طلب کی جائے گی۔
سرپرستوں کی اکثریت، جو تیسری زبان پسند کرے گی وہ

اسکولوں میں تیسری زبان کی حیثیت سے رائج کی جائے گی جہاں سرپرستوں کی ایک خاصی تعداد کوئی دوسری زبان چاہتی ہو وہاں موجودہ ہی عملہ کی از سر نو تنظیم کرکے اس تیسری زبان کی بھی تعلیم دینے کی کوشش کی جانا چاہئے۔

آبادی کے بڑے مراکز میں ایک سے زیادہ تیسری زبان کا انتظام کرنا اس طرح ممکن ہے کہ اس تیسری زبان کو مناسب طور پر بانٹتے ہوئے چند اسکولوں میں رائج کردیا جائے۔

علاوہ آمد کا طریق کار یہ مقرر کیا گیا ہے کہ ثانوی اسکولوں کے پرنسپلوں اور لوکل بورڈ کے اسکولوں کے نگراں عملہ کا ایک جلسہ ہر اسکول کے لئے اصل تیسری زبان کا' جو موجودہ عملہ سے رائج کی جا سکتی ہو، انتخاب کرنے کے لئے بلایا جائے۔ اس کے بعد فوراً ہی تیسری زبان کی تعلیم شروع کردی جائے۔

۵۔ مذکورہ بالا باتوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ:

(۱) یوپی کے بیشتر اسکولوں میں جو تیسری زبان پڑھائی جائے گی وہ زبان وہ ہوگی جو اکثریت کی پسند کی ہوئی ہو نہ کہ وہ زبان جو کسی لسانی اقلیت سے تعلق رکھنے والا کوئی طالب علم سیکھنا چاہتا ہے۔

(ب) لفظ "خاصی" ایک مبہم لفظ ہے اور پرنسپل اور لوکل بورڈ کے حکام اس کی جس طرح چاہیں تاویل کرسکتے ہیں۔

(ج) اس وقت بھی یہ قاعدہ ہے کہ ثانوی درجات میں اگر پانچ طالب علم کوئی اختیاری مضمون لینا چاہیں تو اس اختیاری مضمون کی تعلیم رائج کردی جائے گی۔ لازمی تیسری زبان کے سلسلے میں اس قاعدہ کو بالکل نظر انداز کردیا گیا ہے۔

(د) اندیشہ ہے کہ گشتی چٹھی کی یہ شرط کہ "موجودہ عملے کی مدد سے" کسی اور تیسری زبان کا انتظام کیا جاسکتا ہے اُردو کیلئے مُضر پڑے گی۔

۶۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ مالی دشواریوں کی بنیاد پر یا ٹیچروں اور کتابوں کی کمی کی بنیاد پر فقرہ (ج) کے تحت اُردو کی تعلیم کے انتظام کا مطالبہ پورا ہی نہیں کیا جائے گا یا بہت ہی کم صورتوں میں پورا کیا جائے گا۔

۷۔ اس اندیشہ کو اس بات سے اور بھی تقویت پہنچتی ہے کہ حکومت یوپی کے مذکورہ بالا حکم میں یہ تو کہا گیا ہے کہ کوئی بھی ہندوستانی زبان لی جاسکتی ہے، لیکن انتخاب کا آخری فیصلہ ہیڈ ماسٹروں اور پرنسپلوں پر چھوڑا گیا ہے۔

۸۔ یہ بات کہ ہمارے اندیشے بے بنیاد نہیں ہیں اعظم گڑھ ضلع پریشد کی قائم کی ہوئی مثال سے ثابت ہوجاتی ہے جس نے حال میں فیصلہ کیا ہے کہ اس کے کنٹرول میں جتنے بھی اسکول ہیں ان میں فقرہ (ج) کے تحت صرف سنسکرت پڑھائی جائے گی۔ یہ رجحان خاصا عام ہے۔

۹۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے اپنی چوتھی رپورٹ میں کہا ہے کہ ریاستی حکومتوں نے لسانی اقلیتوں کو تحفظات دینے میں وہ جوش و خروش نہیں دکھایا جس کی ان سے توقع تھی۔ یہی بات پانچویں رپورٹ میں بھی دوہرائی گئی ہے اس معاملے میں حکومت یوپی کا ریکارڈ بہت مایوس کن ہے۔

یوپی کی اُردو بولنے والی آبادی بہ دلی محسوس کرتی ہے اور مرکز سے مدد کا آسرا لگائے ہوئے ہے۔ فرقہ پرست پارٹیاں اس صورت حال سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ حکومت یوپی نے وزارت داخلہ کے ۱۹۵۶ء کے اعلانیہ پر بھی جو ریاستوں کی تنظیم کمیشن کی سفارشات پر مبنی تھا پوری طرح عمل نہیں کیا دستور کے سیکشن ۳۵۰ اے میں پرائمری درجات میں مادری زبان سکھانے کا انتظام کرنے کے لئے جو کچھ کہا گیا ہے اس کے سلسلے میں حکومت یوپی نے جو کچھ کیا ہے وہ مثلاً بہار کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ یوپی میں پرائمری درجات کے اُردو بولنے والے طلبہ کی تعداد مجموعی آبادی کے عام تناسب کے لحاظ سے ۲۳۹۶۷۰۵ ہونا چاہیئے لیکن عملی حیثیت سے ان کی تعداد ۷۶۰۵۵ ہے (لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی چوتھی رپورٹ کے پیراگراف ۱۰۲ کی رو سے)

۱۰۔ ان حالات میں انجمن ترقی اُردو (ہند) ہندوستان کی اُردو بولنے والی آبادی کے خاص ادارہ کی حیثیت سے محسوس کرتی ہے کہ مرکز کو ہدایت کرنا چاہیئے کہ حکومت یوپی حسب ذیل باتوں کا انتظام کرے:-

(۱) اگر پانچ طالب علم تیسری زبان کی حیثیت سے اُردو لینا چاہیں تو اُردو پڑھانے کے انتظامات کردینے چاہئیں۔

(ب) جن علاقوں میں گذشتہ مردم شماری کی رو سے اُردو بولنے والوں کی آبادی خاصی ہے، وہاں یقینی طور پر اسکولوں کی ایک معقول تعداد میں اُردو پڑھانے کا انتظام کردیا جائے تمام سرکاری اسکولوں کو اصول بنا لینا چاہیئے کہ وہ اس پر عمل کریں گے۔

(ج) اگر پانچ یا اس سے زیادہ طالب علم درخواست کریں کہ انھیں اُردو پڑھانے کا انتظام کیا جائے اور پھر بھی اس کا انتظام نہ ہورہا ہو تو ڈائرکٹر تعلیمات سے براہ راست رجوع کیا جاسکے جو اُردو کی پڑھائی کے انتظام کے لئے ضروری اقدامات کرے۔

(د) لسانی اقلیتوں کے کمشنر سے کہا جائے کہ وہ اس بات کا جائزہ لے کہ اس بارے میں کس طرح عمل ہورہا ہے اور ہندوستان کے صدر کو الگ سے ایک تحریر پیش کرے۔

از ضیاء احمد بدایونی

تبصرہ

المختار من شعر ابن الدمینہ

(ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

کتاب غالباً مرتب سے پانچ روپے میں ملے۔

ابن الدمینہ کا شمار عربی کے قدیم اور خوش گو شعرا میں ہے مگر عجب اتفاق ہے کہ کئی بار شائع ہونے کے باوجود اس کا کلام اب تک گمنامی میں تھا۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے جو اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں کی بنا پر علی گڑھ میں اور علی گڑھ سے باہر بھی کافی شہرت رکھتے ہیں، مختلف مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مصادر کو سامنے رکھ کر شاعر مذکور کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے جو مسلم یونیورسٹی پریس نے ٹائپ میں نہایت اہتمام سے چھاپا ہے۔ آخر میں متعدد مفید فہرستیں اور غلط نامہ درج ہے۔ ادارۂ علوم اسلامیہ اور خصوصاً ڈاکٹر صاحب اس علمی خدمت پر تمام عربی سے ذوق رکھنے والے اصحاب کی طرف سے شکر کے مستحق ہیں۔ ابن الدمینہ کے عہد کے بارے میں متضاد بیانات ملتے ہیں، خود ڈاکٹر صاحب نے صفحہ ۹ پر تحریر کیا ہے کہ شاعر کے اخبار و اشعار اور داخلی شواہد سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ابن الدمینہ کم از کم مخضرمی الدولتین ضرور تھا مگر پھر موصوف صفحہ ۱۰۔۱۱ پر لکھتے ہیں کہ یہ عجیب ہے، کہ وہ مخضرمی الدولتین ہو۔ جب قرائن اس کے موید ہیں کہ وہ ہارون الرشید کے عہد میں قتل ہوا ہے تو کیوں نہ اس کو عباسی شاعر مان لیا جائے۔

یہ بھی تعجب ہے کہ شاعر کی چار محبوبہ نازنینوں میں سے صرف تین کے بارے میں اطلاعات بہم پہنچائی گئی ہیں، اور چوتھی ام عمرو غریب کو لائق اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ تاہم ان جزوی فروگذاشتوں سے کتاب کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

کتابیں ملیں

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

نوائے دل (قیمت ۱.۵۰) **آہنگ حیات** (قیمت ۲.۵۰)

مصنف: محمد مشار الرحمن خاں مشار

ناشر: بیت الاشاعت۔ چھاونی ناگ پور

سائز: ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۹۶

صفحات آہنگ حیات ۲۰۸

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا۔